© rasailojaraid.com

کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں، وہی خواب تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالہ کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ، اور جسکے بادبان تار تار ہیں، سب سے بڑا مادّی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی، اقبال کا سہارا تھا، سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا (رحمہ اللہ و طاب ثراہ)، خود اپنی طاقت کو دیکھتا ہوں تو وہ بمنزلہ صفر ہے، دو چار ساتھی جو ملے ہیں، ان کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ و درماندہ ہیں، اور دوسری طرف وہ حال نظر آتا ہے جسکو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ - اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں، سب مادّی سہارے جھوٹے اور ناقابلِ اعتماد ہیں، وہی اصلی اور حقیقی سہارا ہے، وہی طاقت کا منبع ہے، وہی اسباب کا مالک اور مسبب ہے، اور وہی حامی و ناصر ہے، عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ -

---

زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، - اسکو ایسے الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا جنکے درمیان کوئی ربط اور کوئی تعامل نہ ہو ـــ یہ ایک حقیقت تھی جس کو الٰہی شریعت کے پیغامبروں نے قدیم ترین زمانے سے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی اس کو سمجھایا کہ اس ناقابلِ تقسیم وحدت کو گمراہی سے بچانے اور حقیقی ترقی کی راہ پر چلانے کیلیے ایک ایسی ہمہ گیر قوت ضابطہ کی ضرورت ہے جو محض انسان کے اپنے ناقص علم اور اسکی خواہشات نفس پر مبنی نہ ہو بلکہ ہدایتِ ربانی اور قانونِ شرعی پر مبنی ہو۔

انسان صدیوں تک اس حقیقت کو جھٹلاتا رہا۔ زندگی کی وحدت کسی طرح اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میرا مذہب میرے دل کی چیز ہے۔ میری معاشرت میرے گھر کی چیز ہے۔ میری معیشت میری دوکان اور میرے کھیت اور میرے کارخانے کی چیز ہے۔ میرے تمدن کا ایک اور دائرہ ہے۔ میری سیاست ایک دوسرے دائرے میں بند ہے۔ اس طرح میں اپنی ہر چیز کو الگ الگ خانوں میں رکھ سکتا ہوں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ یہ سب ایک ہی قوتِ ضابطہ کی گرفت میں آجائیں۔

مدتوں کے تجربات نے آخر کار اس خیال کی غلطی واضح کردی۔ زندگی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ وحدت کے فطری رجحان نے تقسیم کی کسی تجویز کو نہ چلنے دیا، اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ جب کبھی زندگی کے کسی اہم شعبہ پر کسی قوتِ ضابطہ کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ رفتہ رفتہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھا کر ہی رہی، خواہ وہ اس خاص شعبہ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ بالآخر انسان کو ماننا پڑا کہ فی الواقع زندگی اپنے تمام ظاہری شعبوں کے ساتھ ایک ہی مربوط شے ہے، اور اس کو منضبط کرنے کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی قوتِ ضابطہ کی ضرورت ہے۔

پہلے نکتہ کو تسلیم کرنے کے بعد اب تمام تر جھگڑا دوسرے نکتہ پر رہ گیا، یعنی یہ کہ اس ہمہ گیر قوتِ ضابطہ (اسٹیٹ) کی نوعیت کیا ہو؟ آیا وہ دینی ہونی چاہیے، یا لادینی؟ اسی مسئلہ کے حل پر اجتماعِ انسانی کی آئندہ شکل و صورت کا انحصار ہے۔ لادینی اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمدن و معاشرت ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے دین کا اثر نکل جائے، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ دل و دماغ کے ریشے بھی اس سے خالی ہو کر رہیں، خواہ دستورِ اساسی میں دین اور اس کے متعلقات کو محفوظ رکھنے کا کیسا ہی پختہ اور پرخلوص عہد کیا گیا ہو۔ برعکس اس کے دینی اسٹیٹ کے یہ معنی ہیں کہ جسمِ اجتماعی کی ایک ایک رگ اور ایک ایک ریشے سے زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مشینی تصور اور حیوانی نصب العین کو نکال باہر کیا جائے۔

اس وقت تمام دنیا کے سامنے یہی ایک بنیادی مسئلہ ہے، اور ہندوستان میں جو سوال پوری قوت کے ساتھ ہمارے سامنے آگیا ہے وہ بھی یہی ہے۔

اسٹیٹ کا وہ تصور اب بالکل فرسودہ ہو چکا ہے جسے انیسویں صدی کے علمائے سیاست بڑے زور و شور سے پیش کرتے تھے کہ "یہ ایک مصنوعی چیز ہے جسے افراد کی حفاظت جان و مال اور انکی شخصی آزادی کو برقرار رکھنے کیلیے وجود میں لایا جاتا ہے"۔ وہ دن اب گذر چکے جب حکومت کی طرف سے اگر کوئی معاشی، تعلیمی، صنعتی، یا معاشرتی اسکیم پیش ہوتی تھی تو اس کو "نانی اماں کے احکام" (Grandmotherly legislation.) قرار دیکر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اور حکومت کو مشورہ دیا جاتا تھا کہ اپنے دائرے کے اندر رہے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ اب اسٹیٹ کا دائرہ قریب قریب اتنا ہی ہمہ گیر ہو گیا ہے جتنا مذہب کا دائرہ ہے۔ اب وہ یہ بھی فیصلہ کرتا ہے کہ آپ کیا پہنیں اور کیا نہ پہنیں۔ کس سے شادی کریں، کس سے نہ کریں، اور کس عمر میں کریں۔ اپنے بچے کو کیا پڑھائیں، کیا پہنائیں، اور کس قسم کی زندگی کے لیے تیار کریں۔ اپنی گفتگو اور تحریر کے لیے کونسی زبان اور کونسا رسم الخط استعمال کریں۔ غرض اس طرح اسٹیٹ نے اپنے حدود اقتدار میں رہنے والوں کی زندگی کے کسی جزئی سے جزئی معاملہ کو بھی اپنی فیصلہ کن مداخلت سے آزاد نہیں چھوڑا ہے اور اب کوئی حد ایسی مقرر کرنا مشکل ہے جسکے متعلق یہ کہا جا سکتا ہو کہ اسٹیٹ کے اختیارات وہاں جاکر ختم ہو جاتے ہیں۔ خواہ فاشستی اسٹیٹ ہو یا اشتراکی، دونوں میں "کلیت" (Totali-tarianism.) کی شان یکساں نظر آتی ہے۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسے جمہوری ممالک بھی، جو قدیم سیاسی نظریات کو اب تک سنبھالے ہوئے ہیں، اجتماعی زندگی پر اسٹیٹ کے روز افزوں اقتدار کو تسلیم کرتے جا رہے ہیں، اور ہندوستان میں بھی "اسٹیٹ" کا ارتقار اسی ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اسٹیٹ قریب قریب اسی مرتبہ کا مدعی بنتا جا رہا ہے جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ خطاء و نسیان سے معصوم ہے۔ اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد اسکی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرضِ عین ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے۔ فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف اسٹیٹ کیلئے ہے، اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں۔

یہ کُلیت کا رنگ جو اب اسٹیٹ اختیار کر رہا ہے، اگرچہ وحدتِ حیات کی حقیقت سے قریب تر ہے، مگر یہ اسکے صالح ہونے کا ضامن نہیں ہے۔ اسکے صالح یا فاسد ہونے کا مدار تمام تر اس سوال پر ہے کہ اسٹیٹ کی قوت کا ماخذ کیا ہے اور اسکی اساس کس قانون پر ہے۔ اگر وہ قانونِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہو، اور اس کی طاقت کا ماخذ ایک ایسی ترقی یافتہ رائے عام ہو جس میں توسط و اعتدال، اور حق پسندی کی اعلیٰ صفات موجود ہوں، تو ایسے کلی اسٹیٹ سے بڑی کوئی رحمت اس زمین پر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اسکے برعکس اس کی بنیاد انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر ہو، اور اسکی قوت کا ماخذ ایک ایسی قومیت ہو جس پر اقتدار کی حرص اور اپنے استعلا کی خواہش مسلط ہو گئی ہو تو ایسا کلی اسٹیٹ زمین پر خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ وہ جس قومیت سے وجود میں آئیگا اس سے مختلف قومیت رکھنے والوں کیلئے اسکے دائرے میں زندگی گذارنا محال ہو جائیگا۔ وہ اپنی کلیت کی پوری طاقتیں ان کے امتیازی وجود کو فنا کرنے میں صرف کردیگا، اور اسکی مہلک دخل اندازی سے ان کا دین، انکی تہذیب، انکا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاق، انکی معاشرت، انکی زبان، ان کا ادب، غرض کوئی چیز محفوظ نہ رہیگی۔ اشتراکی روس نے روسی مسلمانوں کے وجود قومی کو مٹانے کیلیے جو کچھ کیا، فرانسیسی امپیریلزم نے تونس، الجزائر، اور مراکش کے عربوں کو فرنچ قومیت اور فرنچ تہذیب میں جذب کرنے کیلیے جو کچھ کیا، زیکوسلوواکیا میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک جرمن اور ہنگرین آبادی کی قومیت فنا کرنیکے لیے جو تدبیریں کی جارہی تھیں، نازی جرمنی میں یہودی قومیت کیساتھ جو برتاؤ ہورہا ہے ان سب مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نوعیت کا ہمہ گیر اسٹیٹ اپنے اصول سے مختلف اصول رکھنے والوں کیلیے کیا کچھ بن سکتا ہے۔

قدیم فرعونیت قومی امپیریلزم کی صرف ایک ہی شکل سے واقف تھی، یعنی ذبح اطفال۔ مگر جدید فرعونیت کے پاس ایک قوم کو آہستہ آہستہ تحلیل کرنے (Denationalisation) کے بیسوں ہتھیار ہیں، مثلاً قوم پرستی کی تبلیغ، تعلیم کے ذریعہ سے تہذیب کے بنیادی تصورات کو بدل دینا، قانون سازی کے ذریعہ قوانین معاشرت کو مسخ کردینا، معاشی پالیسی کے ذریعہ دل و دماغ اور دست و پا کو خریدنا، اور جو خریدے نہ جاسکیں انہیں بھوکا مار دینا، انتخابات کا ایسا نظام مقرر کرنا جس میں قلیل التعداد جماعت کی آواز قطعاً گم ہوکر رہ جائے، اور ایسی ہی بکثرت دوسری تدبیریں، جن کو آج کل کا ایک ہمہ گیر اسٹیٹ بڑی آسانی سے اختیار کرسکتا ہے، اور کر رہا ہے۔

ہندوستان میں ہمارے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کو نماز پڑھنے دی جائے اور روزہ رکھنے دیا جائے یا ہماری مسجدوں کو کھڑا رہنے دیا جائے، یا ہمیں اردو بولنے اور لکھنے سے نہ روکا جائے، وَاَشیَاءٌ اُخرٰی مِن ہٰذا القبیل۔ لہذا وہ بنیادی حقوق جن کو بار بار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہرایا جاتا ہے، اور جن کی بنا پر ہمارے عالی مرتبت مذہبی پیشوا بھی جگہ جگہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ "کانگریس تمہارے مذہبی و ملی حقوق کی محافظ ہے" قطعاً بے معنی ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہاں جو اسٹیٹ پیدا ہو رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔ اگر اس کی نوعیت اسی دوسری قسم کی ہو جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اور ہم اس کو وجود میں آجانے دیں، یا خود اسکے قیام میں مدد دیں تو یہ ہمارے لیے قومی خودکشی کا ہم معنی ہوگا۔ ایسے اسٹیٹ میں بنیادی حقوق کی فہرست اگر کراچی کی فہرست سے ہزار گنی زیادہ طویل بھی ہو تو وہ بے کار ہوگی۔ اس کی حیثیت محض ایک افیون کی سی ہوگی کہ اسکی پینک میں ہم اطمینان سے پڑے سوتے رہیں، اور ایک لادینی اسٹیٹ پُر امن نفوذ (Peaceful penetration) کے ذرائع استعمال کرکے ہندوستانی مسلم قوم کو پچاس سال کے اندر اندر پوری طرح تحلیل کردے۔ ایسا اسٹیٹ اگر وجود میں آرہا ہے تو اس صورت میں ہمارے سامنے سوال یہ نہ ہوگا کہ اس اسٹیٹ میں ہماری حیثیت کیا رہیگی — اسلیے کہ حیثیت جو رہیگی وہ تو اظہر من الشمس ہے — بلکہ سوال یہ ہوگا کہ ان ابتدائی مراحل میں اس بچۂ فرعون کے نشو و نما کو روکنے اور اس کو صالح نہیں تو کم از کم غیر فاسد بنانے کی صحیح صورت کیا ہے — آج اسی نقطۂ نظر سے ہم حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک ہندوستانی اسٹیٹ، یا وطنی حکومتِ خود اختیار کی پیدائش اس طور پر نہیں ہو رہی ہے جس طرح ایک شخص کسی شخص کو مار کر اسکی جگہ لیتا ہے، بلکہ اس طرح ہو رہی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ایک اسٹیٹ کو فنا کرکے دوسرا اسٹیٹ نہیں بنایا جارہا ہے، بلکہ ایک اسٹیٹ کے اندر سے دوسرا اسٹیٹ آہستہ آہستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکل رہا ہے۔ دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کیلیے کہا تو یہی گیا تھا کہ ہم آزادی کامل چاہتے ہیں، اور برٹش انڈین حکومت کو فنا کر کے اسکی جگہ ایک آزاد حکومت قائم کرینگے۔ مگر جو تصورات اب سے دس برس پہلے نہرو رپورٹ کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے ان میں سرِمو فرق نہیں آیا ہے۔ جدید دستور کی رو سے صوبوں میں جو حکومت خود اختیاری قائم کی گئی ہے، اس کو قبول کیا جا چکا ہے، اور اب وفاقی اسکیم کو قبول کرنے میں جو کچھ تامل ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اسکے چند اجزا ر قابلِ اعتراض ہیں۔ وہ اگر نکال دیے جائیں تو دستور جدید کا یہ حصہ بھی اسی طرح قبول کر لیا جائیگا جسطرح پہلا حصہ قبول کیا گیا۔۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آزادی کامل کا راستہ ہے؟

اسس طور پر جو اسٹیٹ کسی اسٹیٹ کے اندر سے پیدا ہوتا ہے، لا محالہ وہ اپنے مورِث کی روایات اور اسکی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، بالکل اسی طرح، جسطرح بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ کے ورثہ کا حامل ہوا کرتا ہے۔

اور بات صرف یہیں تک نہیں ہے کہ یہ ہندوستانی اسٹیٹ اپنی انگریزی ماں کے پیٹ سے برآمد ہو رہا ہے۔ بلکہ درحقیقت اس بچے کا حمل بھی انگریزی نظریات و افکار ہی کے نطفہ سے قرار پایا تھا۔ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا تخیل پیدا ہی اُس مغربی تعلیم سے ہوا جو انگریزی زبان اور انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کے واسطے سے ہندوستان تک پہنچی تھی۔ اس بنا پر لازماً یہ تخیل اُنہی سیاسی نظریات اور اُنہی روایات کے خمیر سے پیدا ہوا جن کا نشو و نما انگلستان کے مخصوص ماحول اور انیگلوسیکسن قوم کے مخصوص حالات میں ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر اس تخیل کو صورتِ فعل میں لانے کا سہرا بھی حقیقت میں انگریزی دماغ، بلکہ انگریزی حکومت ہی کے سر ہے۔ مسٹر اے او ہیوم (Hume.) پہلے شخص تھے جنکے ذہن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کرنیکا خیال آیا۔ ابتداءً ان کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ ہندوستان کے سیاسی دماغ سال میں ایک دفعہ جمع ہوکر تبادلۂ خیالات کیا کریں، اور جس صوبہ میں ان کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر جلسہ کی صدارت کرے۔ لارڈ ڈفرن جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے، انہوں نے اس تجویز کو ناپسند کیا، اور یہ رائے دی کہ ہندوستان میں ایسی ایک جماعت ہونی چاہیے جسکی حیثیت یہاں ویسی ہی ہو جیسی انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition.) کی ہے، تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کرکے اس کے نقائص دور کرے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اسکی آزادیٔ رائے میں خلل انداز ہوگی۔ لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو مسٹر ہیوم نے انگلستان کے عمائد سیاست کے سامنے پیش کیا، اور اکثر نے اس کی تائید کی۔ ان میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی بھی شامل تھے (ملاحظہ ہو ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی کتاب "ہسٹری آف کانگریس" صفحہ ۲۴ و ۲۵)

کہا جاتا ہے کہ اب "قومی تحریک" کی نوعیت میں انقلابِ عظیم واقع ہوگیا ہے۔ صورت ظاہری کو دیکھتے ہوئے تو ہم بھی کہینگے کہ ہاں، واقعی انقلاب ہوگیا ہے۔ مگر یہ انقلاب ویسا ہی ہے جیسا ایک شخص کی حالت میں شیر خوارگی سے ۵۲ برس کی عمر کو پہنچنے تک ہوا کرتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ قد و قامت، سمجھ بوجھ، افکار و تخیلات، اور افعال و حرکات میں کیا انقلاب ہوا؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا اس کی فطرت بدل گئی؟ آج ۵۲ برس کے بعد بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ باایں ہمہ شور و غوغا اس تحریک کی حیثیت برطانی سلطنت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اندر اُسی حزب الاختلاف کی سی ہے جس کا تخیل لارڈ ڈفرن نے پیش کیا تھا۔ یہ کوئی انقلابی تحریک نہیں ہے جسکا کام ایک سلطنت کو مٹا کر دوسری مختلف الاصل سلطنت قائم کرنا ہو۔ بلکہ یہ ایک حزب الاختلاف ہے جو ایک ہی نظام سلطنت کے اندر برسر اقتدار پارٹی کو شکست دیکر اپنی وزارت قائم کرتی ہے۔ حکومت تو ضرور بدل جاتی ہے، مگر اسٹیٹ کا ڈھانچہ وہی کا وہی رہتا ہے —— آٹھ برس پہلے لاہور میں آزادیٔ کامل کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس سے دھوکا کھانے والے صرف بلید الذہن تھے، مگر آج یہ تین حقائق کے ظاہر ہو جانے پر بھی جو دھوکا کھاتا ہے، اسکی بینائی کا ماتم کرنا چاہیے۔

قانون فطرت کے مطابق اس "بچۂ فرعون" کو اپنی ماں اور باپ سے بہت سی خصوصیات اور روایات ورثہ میں ملی ہیں، مگر یہاں ان سب کو نمایاں کرنیکے بجائے ہم تین اہم ترین چیزوں کا ذکر کرینگے وطنی قومیت۔ ڈیماکریسی (جمہوریت) کا انگریزی ماڈل، اور حکومت کا پارٹی سسٹم —— یہ تین چیزیں مل کر وہ خوبصورت جال تیار کرتی ہیں جن میں بے وقوف مکھی جا پھنستی ہے، اور پھنس جانیکے بعد پھر وہ لاکھ بھنبھنائے اور پھڑپھڑائے، آخر کار اسے طوعاً و کرہاً مکڑی کا جزو بدن بننا ہی پڑتا ہے۔

ہر شخص ایک نظر میں دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان، دو بالکل مختلف قومیں رہتی ہیں، جنکے درمیان، ایک ہی جغرافی خطہ اور ایک ہی آب و ہوا میں آٹھ نو سو برس رہنے کے باوجود، خط امتیاز اس قدر واضح ہے کہ جرمن، اٹالین اور فرنچ قوموں کے درمیان بھی اتنا واضح خط امتیاز نہیں پایا جاتا۔ مذہبی عقائد، نظریۂ حیات، انداز فکر، امیال و عواطف (Sentiments)، اصول تہذیب، طریق زندگی، نظام تمدن و معاشرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض وہ تمام چیزیں جنکے اشتراک سے ایک قوم بنتی ہے، ان کے درمیان نہ صرف یہ کہ مختلف ہیں، بلکہ باہم متعارض بھی ہیں۔ ہندوؤں میں ایک مسلمان، اور مسلمانوں میں ایک ہندو اس سے زیادہ اجنبیت محسوس کرتا ہے، جتنی انگلستان میں ایک جرمن محسوس کرتا ہے۔ یہ ایسی بین چیز ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے کوئی مرد عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندو، ہندو رہتے ہوئے، اور مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے، ایک قومیت بنا سکتے ہیں۔ آزادی وطن کیلیے ان کے درمیان ایسا ایک "بین الاقوامی وفاق" تو ضرور ممکن — اور حصول مقصد کیلیے مفید بھی — ہے، جسمیں دونوں کے حقوق اور حدود کی نگہداشت کیساتھ، مشترک مقاصد کیلیے مشترک جدوجہد اور تعاون ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قومی خصوصیات باقی بھی رکھیں، اور پھر ایک قوم بھی بن جائیں۔ اسلیے کہ قومیت صرف ایسے ہی امور کے اشتراک سے بنتی ہے جو لوگوں کی نگاہ میں مختلف فیہ امور کی بہ نسبت زیادہ اہم ہوں، جنکی حیثیت زندگی میں اساسی امور (Fundamentals) کی ہو، اور جنکے محور پر گھومتے گھومتے آخر کار نظریات، افکار، عواطف، اصول تہذیب، طریق زندگی، اور نظام تمدن و معاشرت سب کے سب ایک مشترک سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔ اگر اسلام اور پرانی ہندویت کے بجائے آزادی وطن کی طلب، اور انگریز کو شکست دینے کا جذبہ اور وطن کو بہر صورت سربلند کرنیکا داعیہ اہم تر اور اساسی چیز بن جائے، تو بلاشبہ اس کا اشتراک انکو ایک قوم بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے، مگر اس صورت میں وہ عقائد اور اصول یقیناً بدل جائینگے جنکی حیثیت انکی زندگی میں اساسی نہ رہیگی اور جنکی اہمیت، اس چیز کے مقابلہ میں کم تر ہو گی جسے وہ بنائے قومیت قرار دیں گے — اغلب ہے کہ ہندو پھر بھی ہندو رہیگا، کیونکہ ایک منکر خدا اور دہریے سے لیکر ایک کٹے سناتن دھرمی تک، دونوں یکساں ہندو ہو سکتے ہیں، مگر ایسی صورت میں مسلمان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان رہنا تو قطعاً محال ہے۔ آج کا مسلمان شائد کسی حد تک ذوحیاتین بننے میں کامیاب بھی ہو جائے مگر اسکے بیٹے اور پوتے تک نوبت پہنچتے پہنچتے اسلامیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

قومیت کی اس حقیقت کو سامنے رکھیے، اور اس بات کو بھی نہ بھولیے کہ اس قسم کی قومیت اگر بن جائے تو ہندو کی ہندوئیت برقرار رہتی ہے البتہ مسلمان کی مسلمانیت ختم ہو جاتی ہے، اور اگر فی الواقع نہ بنے لیکن اسکو بنا ہوا فرض کر کے کام کیا جائے تو اس میں سراسر اُس قوم کا فائدہ ہے جو اکثریت میں ہو کیونکہ یہ مفروضہ قلیل التعداد قوم پر کثیر التعداد قوم کے امپیریلزم، استبداد، اور جلبِ منفعت (Exploitation.) کو پوری طرح مسلط کر دینے کا بہترین وسیلہ بن سکتا ہے ــــ ان دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھیے کہ یہاں کیا پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔

۱۸۸۵ء میں جب اس تحریک کی بنا رکھی گئی تھی، اُسی وقت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ہندوستان ایک قوم بن چکا ہے، چنانچہ کانگریس کا نام ہی انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ پہلے اجلاس میں کانگریس کے جو چار مقاصد تجویز ہوئے تھے، ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:

> "قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشوو ارتقا اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے ہیں (تاریخ کانگریس۔ صفحہ ۲۷)

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیے جن میں پوری قوم براہِ راست حصہ دار ہو۔ اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کیلیے چھوڑ دینا چاہیے"۔

گویا انگریزی تاریخ، انگریزی روایات اور انگریزی ذہنیت سے یہ سبق حاصل کیا گیا کہ ایک جغرافی خطہ میں رہنے والی پوری آبادی کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے، اور اگر وہ فی الواقع ایک قوم نہ ہو تو اسے ایسا فرض کر لینا چاہیے، اور مختلف قومیں جو وہاں رہتی ہوں انکو "اقوام" کہنے کے بجائے ایک قوم کے "طبقے" یا فرقے کہنا چاہیے۔

ابتداءً یہ چیز ایک بالکل بے ضرر سی چیز نظر آتی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ یہ محض الفاظ کا غلط استعمال ہے۔ لیکن تیس چالیس برس تک نشو ونما پانے کے بعد یہ ایک خطرناک چیز بن گئی۔ اب اس مفروضہ نے جو صورتیں اختیار کی ہیں انکی چند جھلکیاں دیکھ کر ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ فتنہ کس رفتار سے بڑھ رہا ہے اور کہاں تک پہنچنا چاہتا ہے:

اسلامی تہذیب و تمدن، مسلمانوں کے قومی حقوق، انکی قومی زبان اور ادب، انکی خصوصیات معاشرت، غرض انکی کسی چھوٹی یا بڑی امتیازی چیز کو برقرار رکھنے کی جو کوشش بھی کی جاتی ہے، اسے علٰحدگی پسندی کا رجحان (Separatist tendency) کہکر قابل ملامت ٹھیرایا جاتا ہے۔ اسکی بنا یہی قومیت کا مفروضہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ "قوم" تو بنی ہوئی موجود ہے۔ اب جو شخص اس قوم میں تفرقہ پیدا کرنے اور کسی جزو کو الگ کرنیکی کوشش کرتا ہے وہ قابلِ ملامت ہے۔ "فرقہ پرستی" کا لفظ بھی اسی معنی کو ادا کرنیکے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، اور یہ بھی انگلیوں میں سے ایک ہے جنہیں قوم پرستی کی زبان نے ایجاد کیا ہے۔ "رجعت پسندی" کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لفظ بھی دراصل اس معنی کیلیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے جس قومیت کیطرف "ترقی" کر رہے ہیں، اس سے روک کر انکے کسی "فرقے" کو پرانی جداگانہ قومیت کیطرف لے جانا "رجعت پسندی" اور ایک سراسر مذموم حرکت ہے (ہمارا مولوی بے چارہ ان معانی سے تو بالکل ناواقف ہے البتہ جب وہ اخبارات میں اور قوم پرستوں کی تقریروں میں کثرت سے یہ الفاظ دیکھتا سنتا ہے، تو بس اتنا سمجھ لیتا ہے کہ "رجعت پسند" اور "فرقہ پرست" کسی بہت برے آدمی کو کہتے ہونگے۔ چنانچہ اب وہ بھی اپنی ترقی پسندی اور سیاسی روشن خیالی کا مظاہرہ کرنے کے لیئے ان الفاظ کو استعمال کرنے لگا ہے)

اسی مفروضہ کی بنا پر تعلیم میں اسلامی تہذیب کے عنصر کو شامل کرنے کی مخالفت کی جاتی ہے، کیونکہ انکے نزدیک یہ چیز مسلمانوں کو "ہندوستانی قوم" میں جذب ہونے سے روکتی ہے۔ چنانچہ یو۔پی کے وزیر تعلیم سوامی سمپورنانند صاحب نے ۴ر اپریل ۳۸ء کو یو۔پی اسمبلی میں جو تقریر فرمائی ہے، اس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کیلیے، جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اسے اپنا گھر بنا لیا ہے، بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں ہے تو اسکو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کیلیے ضرر رساں ہیں۔ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی ہوتی ہے یقیناً ملک کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اسلیے ملک کا عام مفاد مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے" (مدینہ۔ مورخہ ۱۲ اپریل ۳۸ء)

اسی تقریر کا ایک حصہ جسکو ادارۂ مدینہ نے شائد بعض مصالح کی بناپر حذف کردیا ہے، ۱۵ اپریل کے ٹریبیون میں بدیں الفاظ شائع ہوا ہے:

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی، تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکیگی"

یہ ایک بڑے صوبے کے وزیر تعلیم کا بیان ہے، جو ہماری آئندہ نسلوں کیلیے تعلیمی پالیسی متعین کررہا ہے۔ یہی تعلیمی پالیسی صوبۂ متوسط کی "ودیا مندر" اسکیم میں نافذ کی جارہی ہے، جسے خود گاندھی جی نے حال میں "برکت" عطا فرمائی ہے یہی پالیسی تمام ہندوستان کیلیے وِلردھا کی تعلیمی اسکیم میں تجویز کی گئی ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس اسکیم کے مصنف ہماری اُس یونیورسٹی کے شیخ صاحب ہیں جو انگریزی یونیورسٹیوں سے بغاوت کرکے "جامعۂ ملیہ اسلامیہ" نام سے قائم کی گئی تھی، تاکہ ہم اپنی ملت کے بچوں کو ملی نصب العین کے تحت دماغی نشو ونما دے سکیں!

اسی مفروضہ کے تحت قوانین معاشرت کو توڑنے اور ہندو مسلمان کو خلط ملط کرنیکی عملاً ہمت افزائی کی جارہی ہے، کیونکہ جب دونوں ایک ہی قوم ہیں تو انکے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہنی چاہیے۔ حال میں مس حمیدہ طیب جی نے جب مسٹر شنکر لال بینکر کے بھتیجے سے شادی کی تو مہاتما گاندھی نے اسی مفروضہ کی بناپر اپنی "برکتیں" بذریعۂ تار ارسال فرمائیں (ملاحظہ ہو نیشنل کال دہلی۔ مورخہ ۷ اپریل ۳۸ء)۔ ابھی تک یہ محض انفرادی واقعات ہیں مگر "متحدہ قومیت" جس طرح علمائے کرام کے زیر سایہ پرورش پارہی ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ پچاس سال بعد یہ روزمرہ کے معمولی واقعات ہونگے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com